ڈاکٹر خواجہ عبدالحمید یزدانی

سوانح عمری داغ المعروف آئینۂ داغ

ایک تجزیہ

کتاب "سوانح عمری داغ" محمد نثار علی المتخلص شہرت دہلوی کی تصنیف ہے۔ اس کے متعلق جو معلومات اس کتاب سے حاصل ہوتی ہیں ان کے مطابق وہ داغ دہلوی کے خاصا قریب رہا ہے اور داغ کے قیامِ دکن کے دوران تو اکثر اس کی داغ سے روزانہ ملاقات رہی۔ اس کے والد حسین علی فرحت بھی شاعر اور نواب الٰہی بخش کے قریبی ملنے والوں میں سے تھے اور غالباً اسی وجہ سے ان کی شاہی دربار میں بھی آمد و رفت تھی شہرت کا تعلق کچھ عرصہ پنجاب سے بھی رہا۔ وہ یہاں لاہور میں اخبار انجمن پنجاب و پنجاب یونیورسٹی کا ایڈیٹر رہا۔ پھر ریاست جموں و کشمیر کے سررشتۂ تعلیم کا ڈائریکٹر ہو کر کشمیر چلا گیا۔ کشمیر میں "ریزیڈنٹی" بیٹھنے کے بعد جب وہاں نظم و نسق میں تبدیلیاں واقع ہونے لگیں تو وہ مستعفی ہو کر دہلی لوٹ گیا۔ اس کے کچھ عرصے بعد اس کا حیدرآباد دکن جانے کا خیال ہوا جہاں اس وقت اس کا گہرا دوست مولوی سیف الحق قیام پذیر تھا۔ (مولوی صاحب مذکور کبھی انجمن قصور کے ایڈیٹر رہ چکے تھے)۔ چنانچہ وہ سر گریفن (ایجنٹ گورنر جنرل ریاست ہائے مرکزی ہند) اور پنجاب یونیورسٹی کے سابق رجسٹرار ڈاکٹر لائیٹنر سے سر آسمان جاہ بہادر مدار المہام اور دیگر ارکانِ سلطنت کے نام سفارشی چٹھیاں لے کر دکن پہنچا جہاں مولوی مہدی علی محسن الملک کی وساطت سے اس کی ملاقات سر آسمان جاہ بہادر سے ہوئی اور اسے امیدوارِ ملازمت بنا لیا گیا۔ وہاں وہ کتنا عرصہ رہا اس کا کچھ پتا نہیں چلتا، البتہ کتاب زیرِ مطالعہ کی تصنیف (۱۹۰۵ء) کے وقت وہ لاہور میں مقیم تھا۔

سوانح عمری داغ جلد اول عام سائز کے ۱۲۸ صفحات کو محیط ہے، اور ۱۹۰۵ء میں داغ کی وفات کے فوراً بعد چھپی ہے۔ اس میں داغ کی پیدائش، پرورش، تعلیم، اخلاق و عادات اور ملازمت کا ذکر اور شاعری پر تبصرہ ہے، کچھ دلچسپ معلومات ہیں، دعوے ہیں، بعض ہم عصر شعرا (غالب و ذوق وغیرہ) کے مختصر خاکے ہیں اور ان کے پڑھنے کے انداز کا بیان اور انتخاب اشعار ہے۔ داغ و غالب کی شاعری کا موازنہ ہے، کچھ تواریخ ہیں۔ داغ پر وارد بعض اعتراضات کا رد ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ داغ کی وفات پر مختلف شعرا

نے جو منظوم اظہارِ غم کیا اور اخبارات و جرائد نے جو اداریے اور شذرے وغیرہ لکھے انھیں اس میں جمع کر دیا گیا ہے جس سے کتاب کی افادیت میں اضافہ ہوا ہے۔ معلوم ہوتا ہے اس کتاب کی دوسری جلد چھپنے کی نوبت نہیں آئی، بصورتِ دیگر اس کا حوالہ کہیں ضرور نظر آتا، جب کہ اوّل الذکر کا حوالہ "نگار" لکھنؤ کے داغ نمبر (۱۹۵۳) میں تین چار جگہ پر آیا ہے۔

شہرت نے کتاب امیر عثمان علی خان آصف جاہ ہفتم کے نام معنون کی ہے۔ اس وجہ سے کہ "ملا ہے تاج و تختِ سلطنتِ موجودہ کے داغ صاحب کے سخن کا بھی تاج آپ کے ہی سر مبارک پر پبلک نے رکھا ہے تو پھر ہوائے حضور کے فدوی اور کس کے سامنے یہ ناچیز تحفہ پیش کر سکتا ہے۔" (ص ۲)

داغ کی سوانح عمری لکھنے کا سب سے بڑا محرک اس کے لیے اردو زبان کی وہ بہت بڑی خدمت تھی جو داغ اپنی شاعری کے ذریعے بجا لایا۔ اس کے مطابق با محاورہ گفتگو اور فصاحت و بلاغت کے ملکہ کا حامل شخص دوسروں پر فائق و مختار قرار پاتا ہے۔ اسی سبب سے عرب میں امرؤ القیس اور حسانؓ مشہور ہوئے، یورپ میں میکالے اور شیکسپیئر نے نام پایا اور اسی سبب سے ذوق و غالب و مومن نے یہاں فصاحت و بلاغت کا پرچم بلند کیا، اور چونکہ داغ نے "اردو کو پالا اور پروان چڑھایا" تھا اس لیے خیال ہوا کہ اس کی سوانح عمری ضرور لکھی جانی چاہیے۔

اس کتاب کی تالیف کے لیے شہرت کو پہلے پہل چند ایک احباب کے پاس جانا پڑا تاکہ وہ اس کام کا بیڑا اٹھالیں لیکن ہر پھر کر قرعۂ فال خود اسی کے نام پڑا۔ مثلاً سب سے پہلے وہ محمد حسین آزاد مرحوم کے پاس گیا لیکن انھیں اس نے "قدیمی" مرض میں مبتلا پایا۔ جو باتیں ان سے کی گئیں انھوں نے کوئی ہوش کی بات مجھ سے نہ کی اور کہا تو یہ کہا کہ داغ زندہ ہے کون کہتا ہے کہ وہ مر گیا" (ص ۴) جن دوستوں کے پاس گیا ان کا جواب تھا کہ "تم داغ کے دوست ہو اور ان کے ہم عصر۔ پس ان کی سوانح عمری سوائے تمھارے اور کون لکھے؟" اور یوں مجبور ہو کر اس نے اس طرف توجہ دی۔

کتاب کا آغاز "داغ صاحب کی پیدائش اور تعلیم" کے باب سے ہوتا ہے۔ اس کے مطابق نواب مرزا خان داغ والیِ جھروکہ فیروزپور نواب شمس الدین خان کے بیٹے[1] اور نواب احمد بخش خان کے پوتے تھے۔

---

[1] داغ کے والد کے سلسلے میں نساخ کا خاموش رہنا اور اس طرح لکھنا "داغ ... ولد چھوٹی بیگم" (سخن شعرا ص ۱۵۷) اور نیاز فتح پوری مرحوم کے والد کا داغ کے بارے میں یہ کہنا "حرام زادہ اچھا کہتا ہے" (نگار داغ نمبر ص ۳) خاصا معنی خیز ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

ان کی پیدائش ۱۸۳۱ء[۵۲] میں ہوئی۔ صغر سنی میں والد کے سایہ سے محروم ہوئے۔ والدہ نے تعلیم میں اعلیٰ درجہ کی کوشش کی۔ لائق و فائق استاد رکھے۔ مولوی غیاث الدین صاحب کشف اللغات[۵۳] نے بھی انھیں کئی سال تعلیم دی۔ نواب یوسف علی خان والیِ رام پور جب دہلی میں بہت عرصہ رہے تو داغ نے ان سے سکندر نامہ نظامی پڑھا تھا۔ قلعۂ معلیٰ میں قیام کے سبب ان کی عمدہ تعلیم ہوئی۔ (ص ۶)

بقول شہرت قلعۂ معلیٰ میں اس وقت شاعری کا بڑا چرچا تھا۔ بادشاہ سمیت تمام شاہی خاندان "شاعری کا عاشق زار بنا ہوا تھا"۔ چنانچہ اس کا اثر داغ نے بھی لیا اور چھوٹی عمر میں شعر گوئی شروع کر دی، لیکن شروع میں کلام کو چھپاتے رہے، کسی کو نہ دکھاتے، آخر ذوق ان کے استاد ٹھہرے اور انہی نے تخلص "داغ" تجویز کیا۔ بارہ تیرہ برس کی عمر میں مشاعرے کی طرح پر غزل کہی جس کا ایک شعر یہ بھی ہے۔

داغ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں ادھر جاتا ہے دیکھیں یا ادھر پروانہ آتا ہے۔

اس شعر کی بڑی دھوم مچی۔ چنانچہ بقول شہرت جب "مرزا غالب صاحب نے آپ کا یہ شعر سنا تو وجد میں آگئے تھے، بار بار اس شعر کو پڑھتے تھے اور خوش ہوتے تھے اور جو کوئی ان کے پاس آتا تھا اس کو یہ شعر سناتے تھے اور فرماتے تھے کہ کیا شعر لکھا ہے مجھ کو تڑپا دیا ہے۔ یہ مضمون نہ کہیں سنا اور نہ دیکھا۔ (ص ۸)

پھر داغ جلد ہی بڑے بڑے مشاعروں میں شریک ہونے لگے۔ ہر مشاعرے میں نوجوانوں کو داغ کے اشعار سننے کا بے تابی سے انتظار رہتا۔ ایک مرتبہ نواب مصطفیٰ خان شیفتہ کے مشاعرے میں انھوں نے ایک غزل پڑھی جس کا مطلع زبان زد خاص و عام ہو گیا:

شعر و برق نہیں شعلہ و سیماب نہیں کس لیے پھر یہ ٹھہرتا دلِ بیتاب نہیں

اس کے بعد شہرت دہلوی نے بہادر شاہ ظفر کے ایک مصرعِ طرح پر اپنے غزل لکھنے اور دربار میں جا کر بادشاہ کے حضور پڑھنے کا ذکر کیا ہے۔ دربار میں وہ "حضرت قبلہ و کعبہ جناب نواب الٰہی بخش خان صاحب

---

۵۲ اسی کتاب میں اخبار "وطن" سے جو اقتباس لیا گیا ہے اس میں تاریخ ۲۵ مئی ۱۸۳۱ء/ ۱۲ ذی الحجہ ۱۲۴۰ھ درج ہے۔ (ص ۸۶) "مخزن" والے اقتباس میں وہی درج ہے جو "نگار" میں ہے۔ (ص ۷۵)۔ "نگار" میں ۱۲۴۶ھ ہے اور بدھ کے روز دن کے دو بجے کا وقت بتایا گیا ہے۔ (نگار داغ نمبر ۱۹۵۳ء، ص ۹) صحیح ۱۲۴۶ھ ہی ہے (۱۲۴۰ کتابت کی غلطی ہے)۔ نگار داغ نمبر ص ۱۲۰ بھی ملاحظہ ہو۔

۵۳ صحیح "غیاث اللغات" ہے۔ شہرت کو اشتباہ ہوا ہے۔

بہادرؒ کی وساطت سے پہنچا، جہاں اس نے بادشاہ کے سامنے اپنی باری پر غزل پڑھی۔ ان دنوں دربار میں اکثر مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ یہاں اس بات کا پتا چلتا ہے کہ ایسے مشاعروں میں، آج کل کے برعکس، اساتذہ کو پہلے اور چھوٹے شعرا کو بعد میں پڑھنے کی دعوت دی جاتی تھی۔ شہرت نے شعرا کی اس ترتیب کے ساتھ ساتھ ان کے پڑھنے کے انداز کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس کے مطابق جب وہ نواب مذکور کے ہمراہ قلعے میں داخل ہوا تو "حضور جہاں پناہ گاؤ تکیے سے سر لگائے آرام میں" تھے اور "ولی عہد بہادر کی گود میں آپ کے پائے مبارک" تھے۔ چند شعرا ان کے سامنے موجود تھے . . . "اوّل غالب صاحب نے غزل پڑھی، جنھوں نے ایک ایک شعر اس عمدگی کے ساتھ پڑھا کہ سننے والوں کو نقش تصویر بنا دیا" پھر ذوق نے "عمدہ طور پر" مرصع غزل سنائی۔ ان کے بعد دو تین اور شعرا نے پڑھا اور پھر داغ کی باری آئی۔ ان کی غزل تمام ہونے پر بادشاہ نے فرمایا "کیا اچھی طبیعت پائی ہے۔" (ص ۱۱)

شہرت کا کہنا ہے کہ دو چار برس ہی میں داغ مشاعروں کی جان بن گئے اور استادوں کے بعد ان کی باری آنے لگی۔ شاگردانِ ذوق میں وہ سر فہرست تھے اور یہ کہ ان کا غدر سے پہلے کا بہت سا کلام ضائع ہو گیا تھا۔ بصورتِ دیگر "موجودہ دیوان اس کے سامنے پانی بھرتے" (ص ۱۲)۔ ذوق کی وفات (۱۲۷۱ھ) کے بعد داغ کی نام آوری اور زبان دانی کی شہرت اور بھی بڑھ گئی۔ شہزادے ان سے اصلاح لینے لگے۔

شہرت نے اس اعتراض کو "بالکل غلط" قرار دیا ہے کہ "داغ گل و بلبل کے ہی دکھڑے اپنے اشعار میں رویا کرتے تھے"۔ اس کے مطابق غدر پہ داغ کا شہر آشوب "جو فی الحقیقت لاجواب ہے" اس اعتراض کو رد کرتا ہے۔ اپنے اس قول کی تصدیق میں اس نے داغ کی مذکورہ نظم[۵] پوری کی پوری درج کر دی ہے۔ پھر اس نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ نیچرل شاعری میں بھی داغ لاجواب ہے اور اس کا آغاز بھی انھی نے کیا ہے، "خواہ اس

---

۵ یہ نظم مسدس کی صورت میں اور بائیس بندوں پر مشتمل ہے۔ آغاز اس بند سے ہوتا ہے:

فلک زمین و ملائک جناب تھی دہلی بہشت و خلد سے بھی انتخاب تھی دہلی
جواب جس کا نہ تھا لاجواب تھی دہلی مگر نصیب سے دیکھا تو خواب تھی دہلی (صحیح دلی ہے)
پڑی ہیں آنکھیں وہاں جو جگہ تھی نرگس کی
خبر نہیں کہ اسے کھا گئی نظر کس کی (ص ۱۴)

کان سنیے یا اس کان، داغ کی بعض (نیچرل) نظموں کے سامنے شعرائے یورپ کا بول بالا نہیں رہتا ... داغ کی نظم مذکور نے اچھی طرح بتا دیا تھا کہ وہ اس نظم لکھنے میں سب سے اوّل[۵۵] ہیں یا یوں کہو کہ نیچرل نظم کی بنیاد داغ ہی نے ڈالی تھی ... فی الواقع داغ صاحب فطرتی شاعر تھے مصنوعی نہ تھے۔ نیچرل خیالات اور نیچرل مضامین ان کے دائیں بائیں ہجوم کرتے رہتے تھے ... اگر وہ یونان میں پیدا ہوتے تو ہومر بنتے، اگر وہ انگلستان میں ہوتے تو ان کو شیکسپیئر کہا جاتا، اگر فارس میں ان کی پیدائش ہوتی تو فردوسی کہے جاتے اور اگر فرانس میں پیدا ہوتے تو والٹیر ان کو لوگ کہتے[۵۶]۔ (ص ۱۲، ۱۳، ۴۸)۔ ایک اور جگہ اس نے نیچرل شاعری ہی کے ضمن میں داغ کا وہ طویل قصیدہ درج کیا ہے جس کا مطلع ہے:

ہے روز جشن کیوں نہ کہے روزگار عیش ایک ایک غم کے بدلے ہیں سو سو ہزار عیش (ص ۲۳، ۲۶)

شہرت کے مطابق قلعہ معلّٰی خالی ہونے اور بہادر شاہ ظفر کو رنگون بھیجے جانے کے بعد داغ حکیم سعادت علی خاں (سابق وزیر اعظم رام پور) کے بیٹے حکیم ولایت علی خاں (مولف نے اسے "ہمارے برادر مخدوم" لکھا ہے) کے پاس آنولہ (بریلی) چلے گئے۔ یہیں انھیں رام پور جانے کا خیال ہوا، اور حکیم مذکور کی انھیں سفارش میسر آگئی اور وہ دہلی لوٹ آئے (ص ۱۹)۔ شہرت نے داغ کے رام پور پہنچنے کی تاریخیں نہیں بتائیں۔ بہرحال وہاں پہنچنے پر نواب یوسف علی خان نے، جو اگرچہ غالب کے شاگرد تھے، داغ کی بڑی قدردانی کی اور انھیں ولی عہد سلطنت نواب کلب علی خان کا مصاحب بنا دیا۔ نواب یوسف کی وفات پر کلب علی نے انھیں معتمد خاص اور

---

۵۵ اس "اوّل" سے خبر نہیں شہرت کی کیا مراد ہے؟ اگر محض شہر آشوب مراد ہے تو داغ سے بہت پہلے اردو کے شعرا بالخصوص سودا نے شہر آشوب کہے ہیں۔ اگر اس کا مطلب اس کی فنی و ادبی خوبیوں سے ہے تو یہ دعویٰ بھی غلط ہے کہ پہلے شعرا کے شہر آشوب ایسی خوبیوں سے پوری طرح آراستہ بلکہ بعض خوبیوں میں داغ کے اس شہر آشوب سے کہیں بڑھ کر ہیں۔

۵۶ معلوم ہوتا ہے شہرت نے محض اپنی علمی و ادبی معلومات کا سکہ جمانے کے لیے یہ سب نام گنوائے ہیں۔ ورنہ ظاہر ہے کہ ان شعرا کا اپنا ایک خاص میدان ہے اور داغ کا ان سے متعلق کسی بھی میدان سے دور کا بھی تعلق نہیں۔ مثلاً شیکسپیئر ڈرامے کے تعلق سے عظیم ہے اور فردوسی مثنوی گوئی کے باعث صاحبِ عظمت ہے (فارسی غزل کو لیا جائے تو سعدی و حافظ مقامِ رفعت کو چھو رہے ہیں اور داغ اس میدان میں بھی ان تک نہیں پہنچ پائے) داغ صرف ایک چھوٹی سی مثنوی کہہ کر فردوسی کا ہم پلہ کیوں کر ہو سکتے ہیں۔

افسر فراش خانہ ایسی معزز آسامی پہ ممتاز فرمایا۔ یہ وہ موقع ہے جب وہاں تمام شعرائے لکھنؤ موجود تھے چنانچہ امیر، امیر مینائی، امیر اللہ تسلیم، جلال اور قلق وغیرہم سے داغ کی صحبتیں رہیں۔

شہرت ۱۳۰۴ھ (۱۸۸۷ء) میں کشمیر سے رام پور پہنچا۔ مذکورہ شعراسے اسے بھی ملنے کے مواقع حاصل رہے، "لیکن داغ سے روز ملنے کا موقع ہوتا تھا" (ص ۲۲)۔ یہاں شہرت نے داغ سے ایک بیان منسوب کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ داغ کا زیادہ تر مطمح نظر اردو زبان کو خوب تر اور وسیع تر زبان بنانا تھا۔ ایک روز شہرت نے ان سے کہا کہ میں نے خود کو شاعر نہیں بنایا اگر مجھے فرصت میسر آتی "تو میں ایسا شاعر نہ بنتا جیسا کہ آپ بنے ہوئے ہیں۔ میں اپنی نظموں سے قوم کی رہنمائی کا کام لیتا، نہ فقط یہی بلکہ پولیٹیکل اور سوشیل کے دقائق کو نظم کا لباس پہناتا جس سے پولیٹیشن فائدہ حاصل کرتے۔" اس کے جواب میں داغ نے کہا دوست تم سچ کہتے ہو لیکن کیا کہ وں ایک کام اپنے ذمے لیا ہے وہ ہی پورا نہیں ہوتا۔ اس کام کے بارے میں پوچھنے پہ داغ بولے "جس طرح کان میں سے جواہر نکلتے ہیں اسی طرح قلعہ معلیٰ اور دہلی میں سے اردو زبان نکلی ہے جس کے محاورے لال و یاقوت کو پرے بٹھاتے ہیں، پس کوشش یہ ہے کہ دہلی کی شستہ و رفتہ زبان تمام ہندوستان میں پھیل جاوے اور ہر شہر میں ایسی ہی اردو زبان بولی جاوے، جیسی کہ دہلی میں بولی جاتی ہے، گو مجکو اس امر میں بہت کامیابی ہوئی ہے لیکن ابھی اس امر کی تکمیل نہیں ہوئی ہے۔" (ص ۲۲)

رام پور میں قیام کے دوران تک داغ کی شہرت تمام برصغیر میں پھیل چکی تھی۔ چنانچہ جب وہ ایک موقع پر یکایک کلکتہ روانہ ہوئے ہیں تو راستے کے بڑے بڑے شہروں میں تار کے ذریعے یہ خبر پھیل گئی، جس کے نتیجے میں بہت سے شہروں کے عمائدین اور شعرا سٹیشنوں پہ ان کی ملاقات کے لیے دوڑے آئے اور بڑے اصرار ہوئے کہ ہمارے شہر کو بھی اپنے قدوم میمنت لزوم سے مشرف کیجیے" (ص ۲۶)۔ آخر مجبوراً انھیں ایک دو روز کے لیے پٹنہ میں قیام کرنا پڑا۔ کلکتے پہنچے تو ہاتھوں ہاتھ لیے گئے۔ ان کے اعزاز میں مشاعرے ہوئے اور محفلیں جمیں۔

شہرت نے مثنوی فریاد داغ (جو داغ نے کلکتے میں لکھی) کے حوالے سے داغ اور حجاب کی محبت کا ذکر یقین کے ساتھ نہیں کیا اور حجاب کو طوائف کی بجائے ایک شاعرہ لکھا ہے[۵۶] کلکتے میں داغ کی مصروفیت و

---

[۵۶] "... ظاہر ہوتا ہے کہ وہاں ایک شاعرہ حجاب نامی سے آپ کو محبت ہوگئی تھی" (ص ۲۷)۔ اس طوائف کا نام منی بائی اور تخلص حجاب تھا (ملاحظہ ہو "نگار" داغ نمبر، ص ۱۵)

محبوبیت کا تذکرہ کرکے مثنوی فریاد داغ کا مختصر سا انتخاب (۴۵ اشعار) دیا ہے اور پھر یہ بتایا ہے کہ داغ جب رام پور لوٹے ہیں تو کلب علی خاں کی زندگی تک ان کی مزے سے گزری لیکن بعد میں نئی انتظامیہ کی بے توجہی کے باعث انھیں پھر دہلی کا رُخ کرنا پڑا۔ (ص ۳۰)

اردو زبان پر سب سے زیادہ چھاپ فارسی زبان کی ہے یعنی حقیقت میں وہ اردو کی ماں ہے لیکن معلوم نہیں کس بنا پر اسے (شہرت کو) یہ چھاپ کھلتی ہے، چنانچہ اپنی اس کتاب میں اس نے دو تین جگہ اس فارسی دشمنی کا اظہار کیا ہے حالانکہ خود وہ فارسی تراکیب کے استعمال سے اپنا دامن نہیں بچا سکا۔ "زبان اردو" کے تحت ذوق اور شاہ نصیر کے درمیان بگاڑ کا سبب بیان کرکے اور دونوں کا موازنہ کرتے ہوئے اوّل الذکر کی صفائی میں چند باتیں کہی ہیں، پھر یوں اظہارِ خیال کیا ہے: "خدا لگتی کہی جائے گی ذوق صاحب نے اردو کا نیا رنگ اس لیے اختیار کیا تھا کہ معصوم اردو، فارسی کے جنگل سے نکل جاوے جس نے اس پر پورا تصرف کر رکھا تھا۔ ان کا یہ خیال تھا کہ جب اردو زبان میں نہ فقط زندگی پڑ گئی بلکہ وہ زبانوں کے شمار میں آنے لگی تو پھر کوئی وجہ نہیں ہے کہ پورے طور پر اردو زبان نہ لکھی جائے اور فارسی کے محتاج کیوں رہیں" (ص ۳۱) - ذوق کے نزدیک دوسری (یعنی فارسی) زبان کی تقلید اور تصرف میں اردو زبان کا خون ہوتا ہے۔[۵۸] (ایضاً) - اس کے بعد اس نے ذوق کی نظم "شبِ ہجر" نقل کرکے اس کی مشہور غزل: ع "لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے" کا پس منظر بیان کیا ہے۔ پھر غالب کی فارسی پسندی پر چوٹ کی اور کہا ہے کہ غالب نے بھی آخری عمر میں ذوق کی رائے مذکور کو مانا تھا (ص ۳۴) اس کے ساتھ ہی اس نے مرزا غالب سے اپنی ایک ملاقات کا ذکر کرکے غالب ہی کے حوالے سے یہ بتایا ہے کہ اس کی فارسی دوستی اور مشکل پسندی دراصل اس کی جوانی کی نازک خیالیوں کے سبب تھی، اور یہ کہ اپنے بعض اشعار کا مطلب خود غالب بھی نہ سمجھ سکا (العجب):

---

۵۸ یہ خیال شہرت کا ہو تو ہو ذوق کا نہیں ہو سکتا اس لیے کہ "خاقانی ہند" کے قصائد نہ صرف فارسی زبان کی لمبی لمبی تراکیب اور ردیفوں سے پُر ہیں بلکہ ان میں اکثر ماحول بھی ایرانی نظر آتا ہے۔ ملاحظہ ہو پورا قصیدہ:

حبذا ساقی فرخ رخ و خورشید جمال   مرحبا مطربِ ہاروت فن و زہرہ خصال (دیوانِ ذوق - لاہور ص ۱۷ بعد)

یہ ایک مثال ہے، باقی قصائد کا بھی یہی حال ہے۔ اب ذرا دو ایک ردیفیں بھی ملاحظہ ہوں:

نور یہ سحر رنگِ شفق (ایضاً ص ۶۸) آتش و خاک و آب و باد (ص ۲۹۷)

"... میں نے ادب کے ساتھ گزارش کی آپ کا دیوان بھی تو فارسی سے مالا مال ہے۔ فرمانے لگے وہ جوانی کی نازک خیالیاں ہیں۔ شہرت! بعض شعر تو ایسے ادق میری قلم سے نکل گئے ہیں کہ میں اب ان کے معنی خود نہیں بیان کر سکتا۔" (ص ۳۴، ۳۵)

اسی حصے میں اردو زبان کے قلعۂ معلیٰ سے تعلق اور داغ کے اردوئے معلیٰ کے عمدہ عمدہ محاوروں اور الفاظ کے استعمال کرنے کا ذکر ہے جس سے یہ انکشاف ہوتا ہے کہ اس دور میں جامع مسجد دہلی کی سیڑھیوں پر "شہدوں" کی بیٹھک رہتی تھی۔ شہرت نے خود اپنے حوالے سے عوام الناس کی زبان اور اہلِ قلعہ کی زبان میں فرق کی دو تین دلچسپ مثالیں دی ہیں:

"میں نے ... پہاڑ گنج، قدم شریف، شاہدرہ، سبزی منڈی میں سادہ گوشت کو سالن کہتے سنا، لیکن امرا کے محلات میں اس کا نام قورمہ سنتا رہا اور جب میں قلعۂ معلیٰ میں گیا تو اس کا نام بجائے قورمہ کے قمر داغ سنا۔ ہر چیز کے نام (قلعے میں) ایسے موزوں رکھے جاتے تھے جس سے فصاحت اور بلاغت آشکارا ہوتی تھی۔" (ص ۳۷) .... (مثلاً) عام لوگ کہتے تھے "زید کو قے ہوگئی ہے" جبکہ عمائدین اور شہزادگان یوں کہتے "زید نے زمین دیکھی ہے"۔ گویا محاوروں کی ایجاد اور اشیا کے نئے نام رکھنے میں قلعۂ معلیٰ کو بڑا دخل رہا۔

شہرت نے ایک مرتبہ پھر داغ کے کلام پر تحسین و آفرین کے ڈونگرے برسائے اور ان کی چند غزلوں کے کچھ اشعار، جو اسے یاد تھے، درج کیے ہیں (ص ۳۸-۴۲)

داغ کی ریاست حیدرآباد دکن کو روانگی کے ذیل میں شہرت نے یہ ظاہر کیا ہے کہ دکن میں داغ کی آمد خود اس (شہرت) کے ایما پر ہوئی۔ بقول اس کے جب وہ کشمیر سے دکن میں اپنے گھر سے دوست مولوی سیف الحق ادیب کے پاس پہنچا ہے تو ایک روز باتوں باتوں میں داغ کا ذکر آگیا۔ ادیب کی زبانی معلوم ہوا کہ نہ صرف دکن کا ہر شخص بلکہ عمائدینِ ریاست اور خود نظام دکن کلامِ داغ دلچسپی سے پڑھتے ہیں۔ اس وقت میں نے ادیب صاحب سے کہا، داغ صاحب رام پور چھوڑ آئے ... اگر وہ یہاں آجاویں تو کیا تعجب ہے کہ سرکارِ آصفیہ میں ان کا تعلق ہو جاوے، لیکن حیدرآباد دہلی سے دور ہے، خدا جانے کہ آئیں یا نہ آئیں، اگر تشریف لے آئیں تو امید ہے کہ عمدہ نتیجہ نکلے" (ص ۴۴)۔ چنانچہ ادیب نے داغ کو خط لکھا۔ جواب میں داغ نے جو کچھ لکھا اس سے پتا چلتا تھا کہ وہ حیدرآباد آتے ہوئے ہچکچاتے ہیں۔ بہرحال ادیب انھیں برابر خطوط لکھا کیا، تا آنکہ داغ نے ہامی بھر لی۔ ادھر شہرت بیمار ہو کر دہلی لوٹ گیا جہاں اس نے داغ

کو وہاں کے تمام حالات بتلائے جس کے نتیجے میں داغ "غالباً ۱۳۰۵ھ (۱۸۸۸ء) میں حیدرآباد تشریف لے آئے"۔ جہاں وہ شیدی عنبر کے بازار میں ادیب کے مکان پر فروکش ہوئے۔ (ص ۴۴)

دکن میں داغ نے، ادیب کے کہنے پر، ملازمت کے لیے نظام کے حضور عرضی گزرانی لیکن دفتری معمولات کے سبب تاخیر ہوئی تو داغ گھبرا کر دہلی لوٹ گئے۔ یہاں سے کئی دوسرے شہروں میں گئے۔ یہ سیاحت دس ماہ تک رہی اور اس کے ساتھ ہی دکن میں حضورِ نظام باریابی ہوئی۔ جس پر داغ کو دھڑا دھڑ مبارکباد کے پیغام آنے لگے اور نظام دکن کی اس قدردانی کو سراہا گیا۔ اس واقعہ کی تاریخ داغ نے "ملے داغ سلطان سے" سے نکالی:

قدم بوس حضرت کا حاصل ہوا — بڑے شوق سے اور ارمان سے
حضوری کی تاریخ پوچھیں اگر — یہ کہہ دو "ملے داغ سلطان سے"[۵۹]
۱۳۰۵ — ۱۸۸۸

اگرچہ پہلے شہرت نے ادیب کے حوالے سے لکھا ہے کہ حیدرآباد کا ہر کہ و مہ داغ کا قدردان تھا، لیکن بعد میں یہ بھی بیان کیا ہے کہ حضورِ نظام میں باریابی سے قبل حاسدوں نے داغ کی "شہرت کو بدنام" کرنے کی کوشش کی تھی اور اخباروں میں "بہتیرا الا یعنی گند پھیلایا" تھا اور "فضول اعتراض کیے تھے، لیکن چونکہ نظام روشن ضمیر داغ کے کمال کے معترف تھے اس لیے حاسدوں کی چل نہ سکی تاہم بعد میں ان مخالفین نے خود ہی مخالفت ترک کر دی۔ (ص ۴۶)

نظام نے شروع میں داغ کا ۴۵۰ روپیہ ماہانہ وظیفہ مقرر کیا، پھر ایک ہزار ہوا اور بعد میں ڈیڑھ ہزار۔ چنانچہ ایک بار تو داغ کو تنخواہ کا چالیس ہزار روپیہ اکٹھا ملا۔ اس اضافے پر انھوں نے یہ تاریخ کہی:

ہو گیا یہ اضافہ آج دونے سے سوا — یہ کرم اللہ کا ہے یا عنایت شاہ کی
اس ترقی کی کہو اے داغ یہ تاریخ تم — ابتدا سے اپنی ساڑھے پانسو نقدی بڑھی
۱۳۱۲ — ۱۸۹۴-۹۵

اس کے علاوہ داغ نے بعض دیگر مواقع پر بھی تواریخ کہیں، مثلاً نظام کی طرف سے ایک مرصع گھڑی ملنے پر:

گھڑی جب ملی مجھ کو میں نے یہ جانا — مرے بخت کی ساعت نیک آئی
لکھو اس گھڑی داغ تاریخ زیبا — "مرصع منور گھڑی شاہ[۵۱۰] نے دی"
۱۳۱۱ / ۱۸۹۳

---

۵۹ کتاب میں ۱۳۲۵ چھپا ہے جو کتابت کی غلطی ہے۔

۵۱۰ لفظ شاہ میں الف زائد ہے۔ لیکن صحیح تاریخی عدد نکالنے کی خاطر داغ نے مجبوراً اس اضافے کو روا رکھا ہے۔

نظام ہی کی جانب سے سونے کا توڑا عنایت ہونے پر :

عطیات بیہم کا کیا شکریہ ہو — کہ فدوی کو کیا کیا عنایت ہوا
بدیہہ کہو داغ تاریخ تم — "یہ سونے کا توڑا عنایت ہوا"
۱۳۱۲

موصوف ہی کی طرف سے دو تلواریں ملنے پر :

تیز ہیں تیز نگاہوں سے بھی ان کی دھاریں — یہ وہ تلواریں ہیں زخموں کا نہیں جن کے علاج
تیرے قبضے میں ہے تاریخ عطائے شاہی — لکھ دو اے داغ "عنایت ہوئیں تلواریں آج"
۱۳۱۲

نظام دکن کا استاد ہونے کے باعث داغ کو "استاد السلطان" کے لقب سے نوازا گیا۔ داغ کے دیگر القاب حسب ذیل قرار پائے :

"خان بہادر بلبل ہندوستان استاد ناظم یار جنگ نواب مرزا خان صاحب داغ امیر الدولہ فصیح الملک دہلوی استاد حضور بندگان عالی آصف جاہ نظام دکن" (ص ۴۷، ۴۸)

نظام نے داغ کو اپنے شاف میں داخل ہونے کی بھی عزت بخشی تھی، جب کہ کسی دوسرے کو ممدوح کے دربار میں جانے کی اجازت نہیں تھی "لیکن بڑے فخر کی بات ہے کہ داغ صاحب کو آپ کے دربار میں بیٹھنے کی اجازت ہوگئی تھی۔" (ص ۴۸)

اب پھر داغ کی شاعری کی تعریف و توصیف اور ان کے "نیچرل مضامین" کا تذکرہ ہے اور آموں سے متعلق داغ اور غالب کے اشعار الگ الگ درج کیے ہیں تاکہ قاری موازنہ کر کے خود ہی یہ اندازہ کر لے کہ کس کے اشعار بہتر ہیں؛ اگرچہ شہرت نے ایسا تو نہیں لکھا تاہم اس کی عبارت سے کچھ ایسا ہی مترشح ہوتا ہے اور بالواسطہ وہ داغ کے اشعار کو غالب کے اشعار سے بہتر قرار دیتا نظر آتا ہے۔ چند اشعار شروع اور آخر کے ملاحظہ ہوں :

داغ : شاہ نے دیں آم بھری کشتیاں — بحر عطا کیا ہی ہوا موج زن
کشتیوں میں آم جو ہیں رنگ رنگ — داغ کا گھر آج ہے رشک چمن
سرخ میں ہے لالہ رخوں کی بہار — سبز میں ہے سبز خطوں کی پھبن
پھولے پھلے شاہ کا باغ مراد — اور ثمر یاب ہوں اہل زمن
فیض رساں داغ کو یارب رہے — خسرو محبوب نظام دکن

غالب : ہاں دل دردمند زمزمہ ساز — کیوں نہ کھولے درِ خزینۂ راز
خامے کا صفحے پر رواں ہونا — شاخِ گل کا ہے گل فشاں ہونا
مجھ سے کیا پوچھتا ہے کیا لکھیے — نکتہ ہائے خرد فزا لکھیے
بارے آموں کا کچھ بیاں ہو جائے — خامہ نخل رطب لساں ہو جائے
اے خداوند بندہ پرور کو — وارث گنج و تخت افسر کو
شاد و دل شاد و شادماں رکھیو — اور غالب پہ مہرباں رکھیو

جیسا کہ ملاحظہ ہوا داغ نے نظم کی صورت میں اور غالب نے مثنوی کے رنگ میں آم پر اشعار لکھے ہیں۔ غالب کے شروع کے اشعار " ابتدائیہ " کی صورت ہیں اس لیے ان میں کوئی خاص بات نظر نہیں آتی لیکن جہاں وہ آم کی تعریف کرتا ہے وہ اشعار مضمون آفرینی کے لحاظ سے داغ کے اشعار سے بہرحال بہتر اور دلچسپ ہیں۔

اس موازنے کے بعد شہرت نے پھر داغ کی نازک خیالی پر اظہار خیال کیا اور اس کی دلیل میں ایک " خمسۂ داغ بر غزلِ خود " پیش کیا ہے جس میں " حالتِ چشم " کی تصویرکشی کی گئی ہے۔ پہلا بند دیکھیے :

تھی پریشان انتظار سے آنکھ — نہیں ملتی تھی ایک بار سے آنکھ
شکر ہے ہو گئی قرار سے آنکھ — لڑ گئی یارِ گل عذار سے آنکھ
اب نہیں چھپتی ہزار سے آنکھ (ص ۵۳)

شہرت نے اس مجموعے میں داغ کے شاگردوں کی فہرست دینا چاہی تھی لیکن جب وہ اسما لکھنے لگا تو ہزاروں نام سامنے آتے چلے گئے جس کے سبب اس نے یہ ارادہ ترک کر دیا[۱۱] شہرت کے مطابق پڑھے لکھے لوگ تو ایک طرف ان پڑھ لوگوں کو بھی داغ کے بیسیوں اشعار یاد ہوتے تھے جو داغ کی شہرت کی بہت بڑی دلیل ہے۔ (ص ۵۵)

ازاں بعد " داغ کے انتقال کا ماتم " کے عنوان سے شہرت نے اپنا چھ بندوں پر مشتمل ایک ترکیب بند دیا ہے۔ (یہ اشعار کوئی اتنے جاندار نہیں ہیں، بس اپنے جذبات کا سیدھے سادے انداز میں اظہار ہے) اور ساتھ ہی

---

[۱۱] شاگردوں کی کثرت کے بارے میں ملاحظہ ہو نوح ناروی کا بیان۔ نگار داغ نمبر ص ۲۷، نیز انشائے داغ مطبوعہ دہلی ۱۹۴۱۔ مقدمہ (از احسن مارہروی) ص ۱۱

داغ کی وفات کا تذکرہ ہے۔ ۹ ذی الحجہ ۱۳۲۲ھ[۱۲] کو داغ نے دکن میں اس عالمِ فانی سے کوچ کیا۔ "اگر لاکھ بار آسمان گردش کرے اور لاکھ بار دنیا قائم ہو لیکن داغ سا شاعر نہ پیدا ہوا ہے اور نہ ہوگا۔ اس وقت زبانِ اردو کو ناقابل برداشت صدمہ پہنچا ہے جس کی تلافی کیا ہو سکتی ہے۔ اگر چند سال آپ زندہ رہتے تو بہت کچھ اردو زبان کو فائدہ پہنچتا اور اس وقت تو وہ بے کسی اور بے لبسی کے عالم میں ہے، اب کوئی اس کا سر دھڑ نہیں رہا۔" (ص ۶۰) شہرت کے مطابق داغ کی وفات فالج سے ہوئی اور وہ صرف پانچ چھ دن بسترِ مرگ پر رہے۔ اس کا کہنا ہے کہ "داغ کے انتقال سے کچھ پہلے حیدرآباد میں یہ غزل ہر ایک کی زبان پر تھی جس محلے میں جاؤ یہی سن لو:

داغ ہر ایک زبان پر ہے فسانہ تیرا وہ بھی دن آتے ہیں، آتا ہے زمانہ تیرا" (ص ۶۲)

شہرت نے اس کتاب میں مختلف مقامات پر داغ کے اخلاق و عادات اور معمولات پر بھی کسی قدر روشنی ڈالی ہے جو خالی از دلچسپی نہیں:

"داغ بڑے شرمیلے تھے ... ایک مرنجاں مرنج شخص تھے۔ کسی کی گھٹی بڑھی سے ان کو کام نہ تھا، نہ کسی سے چشمک اور نہ کسی سے کاوش رکھتے تھے اور نہ کسی سے ایسی محبت کہ آئندہ وہ مخالفت سے بدل جاوے، دوستوں کے دوست یاروں کے یار تھے۔ شکوہ شکایت کو بُرا جانتے تھے جس سے ملاقات ہو اس کے برخلاف ایک لفظ سننا نہیں چاہتے تھے۔ یہی سبب تو تھا کہ آپ کے ہم عصر آپ کے حریف آپ سے خوش تھے ... جس ریاست میں رہے وہاں کے پولیٹیکل آدمیوں سے الگ رہے، ان سے کوئی تعلق نہ رکھا اور نہ وہ کسی پارٹی میں منسلک ہوئے تھے۔" (ص ۷، ۲۰)

"یہ آپ کی عادت تھی کہ سرکاری کام انجام دینے کے بعد کچھ دیر کام کیا۔ اس کے بعد شاعری کے دھندے میں مصروف ہو گئے، وہ اس میں ہی مگن رہتے تھے۔ ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں سے شاگردوں کی غزلیں اصلاح کے لیے کم سے کم دس بیس روز آتی تھیں، تھوڑی دیر میں آپ اصلاح دے ڈالتے تھے کسی کی غزل کو نہیں ٹالتے تھے۔" (ص ۲۱)

سوائے شاعری کے اور کوئی شوق آپ کو نہ تھا۔ یہ ہی ان کی آنکھ کا تارا تھی یا یوں کہو کہ زندگی کا سہارا تھی۔ شب و روز شعر گوئی کا مشغلہ تھا اور کسی طرف دھیان ان کا نہ تھا۔ امید ہے کہ جب ملک الموت آپ کے سامنے آیا ہوگا تو ضرور آپ

---

[۱۲] مخزن میں ۱۴ فروری ۱۹۰۵ ہے (سوانح عمری داغ ۷۵) نگار داغ نمبر میں ۱۷ فروری ۱۹۰۵ ہے (ص ۱۲۰) جب کہ کیلنڈر کے حساب سے ۹ ذی الحجہ ۱۳۲۲ کو ۱۶ فروری ۱۹۰۵ اتوار کا دن بنتا ہے۔

نے دو چار شعر اس کو دیکھ کر موزوں کر دئے ہوں گے چونکہ آپ تقار بھی بڑے تھے کیا تعجب ہے کہ اس سے دو دو باتیں بھی کی ہوں؟ (ص ۶۰)

داغ کا ماتم کرنے کے ساتھ ہی مؤلف نے شیفتہ، مومن اور غالب وغیرہ کا بھی ماتم کیا اور یہ لکھا ہے کہ "مومن و ذوق و شیفتہ و غالب . . . نہ رہے لیکن وہ اپنی تصویر میرے صفحۂ دل پہ چھوڑ گئے جو اکثر یاد آتے ہیں۔" (ص ۶۳) پھر ان سب کی قلمی تصاویر کے ساتھ ساتھ ان کے سالہائے وفات کا ذکر اور انتخاب اشعار ہے۔ کتاب کا یہ حصہ بھی دلچسپ ہے۔

"مومن پتلے پتلے نازک بدن خوب صورت لمبے لمبے بال کمر پہ پڑے ہوئے اور اونچا انگرکھا پہنے ہوئے چلے جا رہے ہیں . . . شعر کے دھیان میں انگلیوں کو جنبش کرتے ہوئے عجیب چال چل رہے ہیں۔ آپ ہر وقت مضمون کے ہی دھیان میں رہتے ہیں۔" (ص ۶۳)

ذوق فربہ اندام سیاہ رنگ، مشاعرے میں للکار کر پڑھنے والے، بڑے ذی اخلاق، ہر وقت آپ بھی شعر کی دھن میں رہتے تھے۔ ایک بار کورتہ پہنے ہوئے آپ اپنے مکان کے باہر (جو قلعے میں تھا) ٹہل رہے تھے، شعر کے مضمون میں جو گتھے قلعے سے بھی نکل آئے اور دہلی کے چاوڑی بازار میں آنکلے۔ رات کے دو بجے تھے۔ پہرے سے کوتوال گشت کرتا ہوا آ رہا تھا۔ ان کو سپاہی نے آواز دی (کون)، جواب کون دے، آپ تو غزل میں پھنسے ہوئے تھے۔ کوتوال نے حکم دیا کہ پکڑ لو۔ جب کوتوال آپ کے قریب پہنچا تو دیکھتا کیا ہے کہ آپ تو خاقانیِ ہند استاد ذوق ہیں۔ فوراً گھوڑے پر سے کودا اور آپ سے ہاتھ باندھ کر گزارش کی کہ میری گستاخی معاف کیجیے۔ اس وقت آپ یہاں کیوں کر نکل آئے۔ تب آپ کو ہوش ہوا۔ کوتوال نے آپ کو سوار کرا کر قلعے میں پہنچا دیا۔" (ص ۶۴)

"شیفتہ میرے استاد . . . خاصے قدوقامت کے انسان نہایت خوب صورت تھے۔ چہرے سے رعب اور امارت برستی تھی۔ اپنے استاد مومن . . . کے عاشق و شیدا تھے، مثل پروانہ ہر وقت ان کے گرد رہتے تھے۔" (ص ۶۵)

غالب نہایت خوب صورت دراز قدوقامت، ولایتیوں کا لباس رکھتے تھے۔ تمام جمام میں جب آپ بیٹھتے تھے بہت موزوں معلوم ہوتے تھے۔ بڑھاپے میں اگرچہ مُر ہو گئے تھے، ورنہ جسیم و خوب صورت تھے۔ محفل میں اپنا رنگ باندھ لینا ان کی ذرا سی بات تھی۔ شعر ایسے عمدہ طور پر پڑھتے تھے کہ ان سے بہتر کوئی پڑھتا نہ تھا۔"

"قلق میرے استاد... حکیم غلام مولےٰ... پست قد گندمی رنگ۔ آپ بھی اپنے استاد مومن... کی طرح ہر وقت فکر مضامین میں گتھے رہتے تھے۔ بلا کی طبیعت پائی تھی۔ ثانیِ مومن آپ کو کہا گیا ہے" (ص ۶۶)

"بیان میرے کلاس فیلو میر مرتضےٰ... شعر کی دھن میں ایسے مصروف ہوئے کہ امراض دماغی میں مبتلا ہو گئے۔ گرمیوں کی راتوں میں بھی کوٹھڑی میں پڑے رہتے تھے۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے گز بھر کا عمامہ سر پہ رکھتے تھے۔ چکی اور گھوڑے کی ٹاپ کی آواز، کہا کرتے تھے میرے دماغ میں چوٹ لگاتی ہے۔ آپ کے کلام کا ماہتاب بہت بلند تھا۔ بڑے بڑے شاعروں سے چھیڑیں لیں، منہ پھیرا۔ (ص ۶۷)

شہرت نے داغ پر علامہ اقبال کی نظم بھی درج کر دی ہے اور اسے "فی الواقع موتیوں میں تولنے کے قابل" قرار دیا ہے۔ یہ نظم یہاں اپنی پہلی صورت میں ہے اور مخزن سے لی گئی ہے۔ بعد میں علامہ نے اس میں کانٹ چھانٹ کر کے بانگ درا میں شامل کیا تھا[۱۳]۔ اس کے ساتھ ہی مہاراجہ سرکشن پرشاد شاد کی کہی ہوئی چار تاریخہائے وفات ہیں۔ پہلی آٹھ، دوسری اور تیسری سات سات اشعار اور چوتھی دو اشعار کو محیط ہے۔

کعبۂ جاں بلبل باغ جناں (۱۳۲۲) — دہلی کا چراغ بجھ گیا، آہ (۱۳۲۲)

چھپ گیا آنکھوں سے اب وہ آفتاب شاعری — پے اردو زبان تھے داغ فیضی (۱۳۲۲)

داغ کی وفات پر مختلف اخبارات و جرائد نے جو شذرات، اداریے اور مضامین لکھے شہرت نے انھیں اس کتاب میں "اخبارات کا ماتم" کے عنوان سے یک جا کر دیا ہے، جس کی وجہ سے یہ حصہ خاصا وقیع بن گیا ہے۔ اس میں داغ سے متعلق کئی اہم معلومات میسر آئی ہیں اور اس دور کی تنقید کے نمونے بھی سامنے آتے ہیں۔ سب سے زیادہ طویل مضمون "ذوالقرنین" (غالباً مارچ ۱۹۰۵) میں شائع ہوا ہے جس میں داغ کی شاعری سے بحث کرتے ہوئے غالب اور داغ کے بعض ہم مضمون اشعار کا موازنہ کیا گیا ہے۔ ان رسائل و جرائد کی فہرست کچھ اس طرح ہے:

زمانہ کان پور، مخزن لاہور، ذوالقرنین ؟، وطن ؟، نیر اعظم مراد آباد، آگرہ اخبار، پبلک میگزین امرتسر،

---

[۱۳] یہاں یہ نظم چار بندوں پر مشتمل ہے۔ پہلا بند چار شعر، دوسرا نو، تیسرا چھ اور چوتھا آٹھ اشعار پر مشتمل ہے۔ اس کے اشعار میں تبدیلی اور اضافے کے بارے میں دیکھیے "سرود رفتہ" مرتبہ غلام رسول مہر، صادق علی دلاوری، لاہور۔ ص ۱۲۶، ۱۲۷۔

ریاض الاخبار گورکھپور، آرمی نیوز لدھیانہ، البشیر الٰہ آباد، افضل الاخبار دہلی۔

مخزن کے مطابق "جب آپ کے انتقال کی خبر لاہور میں پہنچی تو ہمارے مکرم دوست پروفیسر محمد اقبال صاحب ایم۔اے نے، جو آپ کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں آپ کی وفات کی برجستہ اور فی البدیہہ تاریخ نواب میرزا داغ (۱۳۲۲) کہی، چنانچہ یہ تاریخ پیسہ اخبار لاہور میں شائع بھی ہو چکی ہے ..." (ص ۷۶)

داغ سے متعلق حوالے کی یہ اہم کتاب "شعرا ہند کا ماتم" کے باب پر ختم ہو جاتی ہے۔ اس باب میں اظہار غم اور داغ کو منظوم خراج عقیدت پیش کرنے کے ساتھ ساتھ تاریخ ہائے وفات بھی کہی گئی ہیں۔ ان شعرا میں کچھ داغ کے شاگرد ہیں اور کچھ امیر مینائی کے۔ شعرا میں خاص طور پر قابل ذکر یہ ہیں: مضطر خیر آبادی، شرر کاکوروی، احسن (مارہروی) رضا خان حسن بریلوی، عشرت لکھنوی، اسیر بدایونی اور ریاض گورکھپوری۔ چند تاریخیں ملاحظہ ہوں:

رعب شاہ آبادی: ہو گیا زیر زمین پنہاں سپہر شاعری (۱۳۲۲)۔ حیرت شاہ جہان پوری: آج راہی جہاں سے داغ ہوا (یہی تاریخ سلام الدین نادر اور امیر مینائی کے شاگرد آزاد نے کہی) ثاقب سہسواری: قمری بوستان جنت ہے۔ فیاض شاگرد داغ: کہہ "لعل دہلی نذر زمین دکن ہوا" کوئی ہمن چار شعرا نے "داغ نواب میرزا" کہی ہے۔ ان کی نظموں کا قافیہ ردیف بھی ایک ہی ہے "کیا کہیے" آزاد شیخ پوری: بلبل ہند زین چمن بپرید۔ حفیظ جون پوری: شاعری داغ کے گئی ہمراہ (۱۹۰۵)

انتخابِ حدیث

مولانا شاہ محمد جعفر پھلواروی

یہ کتاب ان احادیث کا مجموعہ ہے جو زندگی کی اعلیٰ قدروں سے تعلق رکھتی ہیں اور جن سے فقہ کی تشکیلِ جدید میں بہت مدد مل سکتی ہے۔ ہر حدیث کی الگ سرخی قائم کی گئی ہے اور اس کا سلیس ترجمہ بھی درج ہے۔ یہ مجموعہ حدیث کی چودہ کتابوں کا خلاصہ اور بے مثل انتخاب ہے۔

صفحات ۲۰+۶۶۴ قیمت -/۴۵ روپے

ملنے کا پتا: ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور ۳